ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

OPEN ACCESS

CC BY NC

محمد اسماعیل

ایم فل اسکالر، شعبہ اردو، ایم۔ وائی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

ڈاکٹر عطارسول (شاکر کنڈان)

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، ایم۔ وائی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

اُردو غزل کی روایت میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا امتزاج: پاکستانی سیاست دانوں کے کلام کی روشنی میں

Muhammad Ismail *
M.Phil Scholar, Department of Urdu, MY University, Islamabad.
Dr. Atta Rasul (Shakir Kandan)
Assistant Professor, Department of Urdu, MY University, Islamabad.
***Corresponding Author:**

The Synthesis of 'Gham-e-Janaan' and 'Gham-e-Dauran' in the Tradition of Urdu Ghazal: In the Light of Pakistani Politicians' Poetry)

This article presents a critical and analytical evaluation of the thematic and stylistic synthesis of Gham-e-Janaan (the sorrow of love/beloved) and Gham-e-Dauran (the sorrow of the era/society) within the tradition of Urdu Ghazal, specifically focusing on the contributions of prominent Pakistani poet-politicians. Historically, classical Urdu Ghazal maintained a traditional demarcation between subjective romanticism and objective socio-political realities. However, with the advent of the Progressive Writers' Movement in the mid-twentieth century, a major conceptual shift occurred. This study explores how key political figures—namely Faiz Ahmed Faiz, Habib Jalib, Maulana Kausar Niazi, and Fakhar Zaman—intellectually reclaimed romantic tropes to articulate collective resistance, civilizational decay, moral crises, and modern existential alienation. Through an stylistic and prosodic analysis of their selected

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

works, the article investigates how traditional symbols of the beloved, the rival, captivity, and dawn were dynamically repurposed into political metaphors without compromising the genre's inherent aesthetic grace (Taghazzul). The article concludes that this unique synthesis not only rescued the ghazal from thematic stagnation but also permanently democratized its diction, ensuring its structural durability and establishing it as an enduring medium of political consciousness in contemporary Urdu literature.

Key Words: *Urdu Ghazal, Gham-e-Janaan, Gham-e-Dauran, Poet-Politicians, Faiz Ahmed Faiz, Habib Jalib, Resistance Literature, Stylistics, Modernism.*

اُردو غزل بنیادی طور پر داخلی محسوسات اور حسیاتی جمالیات کا ایک لافانی مرقع رہی ہے۔ تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو غزل کے خمیر میں غنائیت، رومان اور دروں بینی کی ایک ایسی پُرکشش کیفیت گندھی ہوئی تھی جس نے اسے طویل عرصے تک مادی اور خارجی تغیرات کے براہِ راست دخل سے دور رکھا۔ کلاسیکی عہد میں غزل کو ایک ایسی نازک اور ارفع صنفِ سخن تسلیم کیا جاتا تھا جس کا دائرہ کار صرف محبوب کے حسن، ہجر کی تلخی، وصال کی تڑپ اور رقیب کی ریشہ دوانیوں تک محدود تھا۔ یہ وہ روایتی فضا تھی جہاں مادی دنیا کی کڑواہٹ داخل نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ غزل کا غنائیت پسند مزاج ملکی سیاست اور ہنگامی مسائل کا متحمل ہونا اپنے فنی وقار کے خلاف سمجھتا تھا۔

کلاسیکی شعری رویوں میں 'غمِ جاناں' یعنی عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کو ایک متبرک وجود کا درجہ حاصل تھا۔ محبوب کا وجود ایک ایسی ماورائی اور تصوراتی ہستی تھا جو حسن کی آخری حدوں کو چھوتا تھا اور جس کی جفاؤں پر بھی شکر بجالانا عاشق کا اخلاقی اور فلاحی فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ اس داخلی کائنات میں بیرونی سماج کی تلخیاں، معاشی تفارات اور سیاسی دباؤ کو غیر متعلقہ تصور کیا جاتا تھا۔ عاشق کی تمام تر توانائیاں محبوب کے تصور میں محو رہنے اور اپنے دل کی لٹی ہوئی بستی پر آنسو بہانے میں صرف ہوتی تھیں، جس کے باعث غزل نے ایک خاص قسم کی تہذیبی درویشی اور باطنی سکون کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔

اس کے برعکس، 'غمِ دوراں' یعنی معاشرتی آشوب اور زمانے کے امتحانات کو ایک الگ علمی، تاریخی اور بیانیہ صنف کا موضوع سمجھا جاتا تھا، جیسے کہ 'شہر آشوب' یا مثنویاں۔ اگرچہ دلی اور لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیبوں نے شعرا کو گہرے ذاتی اور اجتماعی صدمات سے دوچار کیا، لیکن انھوں نے ان صدمات کو غزل کے مروجہ عشقیہ لب و لہجے میں براہِ راست داخل کرنے سے گریز کیا۔ کلاسیکی روایت میں یہ مروجہ قاعدہ بن چکا تھا کہ اگر سیاست یا

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

معاشرت کی سنگینی کو غزل کے نازک آبگینے سے ٹکرایا گیا، تو غزل کا روایتی تغزل اور شعری حسن غارت ہو جائے گا۔ اسی لیے، انھوں نے غزل کے داخلی رومان کو خارجی کائنات کے تلخ حقائق سے الگ تھلگ رکھا۔

کلاسیکی عہد کی اس فکری تقسیم کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس دور کے جمالیاتی رویوں کا بغور مطالعہ کرنا ہو گا۔ اُردو غزل کی نشوونما جس درباری اور جاگیر دارانہ نظام کے سائے میں ہوئی، وہاں ادب کو ایک تفریحی اور وجدانی لطافت کا ذریعہ مانا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں کسان کی بھوک، مزدور کا پسینہ یا کسی جنگ کے سیاسی محرکات کو غزل کا موضوع بنانا اس کے معیار کو پست کرنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان شعرا نے غزل کے پردے میں صرف انھی دکھوں کو جگہ دی جو کائناتی، ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی نوعیت کے تھے، جبکہ معروضی مادی مسائل کو غزل کے آستانے سے دور رکھا گیا۔ کلاسیکی غزل کی اس روایتی اور باطنی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ممتاز نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں:

> "کلاسیکی اردو غزل بنیادی طور پر باطن کی آواز ہے۔ یہ مادی دنیا کے ہنگاموں سے گریز کر کے روح کے نہاں خانوں میں پناہ لینے کی ایک شعوری کوشش ہے، جہاں محبوب کی ذات ہی کائنات کا نچوڑ بن جاتی ہے اور زمانے کے سرد و گرم اس داخلی مرکز کے طواف میں گم ہو جاتے ہیں۔" (۱)

یعنی کلاسیکی دور کا تخلیق کار خارجی کائنات کی سنگینی سے فرار حاصل کر کے غزل کے رومانوی حصار میں پناہ لینے کا عادی تھا۔ ان کے نزدیک بیرونی دنیا کا انتشار اتنا بھیانک تھا کہ اسے غزل کی خوبصورت، مترنم اور نفیس دنیا کا حصہ بنا کر اس کے جمال کو داغدار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ، غزل میں زمانے کے آشوب کو براہِ راست بیان کرنے کے بجائے تقدیر کی گردش، فلک کی بے مہر اور زمانے کی کج رفتاری ایسے مبہم استعاروں کے پردے میں چھپا دیا گیا، تاکہ غزل کا اندرونی توازن برقرار رہے۔

میر تقی میر کے کلام میں اگرچہ دلی کی بربادی کا نوحہ صاف سنائی دیتا ہے، لیکن انھوں نے بھی اس المیے کو غزل کے اسلوب میں اس طرح سمویا کہ وہ اجتماعی سیاسی مسئلہ بننے کے بجائے انفرادی دل کا زخم محسوس ہونے لگا۔ "دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے" ایسے اشعار میں جو مٹی کی بربادی کا رنج ہے، اسے میر نے اپنے دل کی اجڑی ہوئی بستی کا استعارہ بنا دیا۔ یہ کلاسیکی شاعری کا وہ کمال تھا جہاں معاشی اور سماجی تباہی کو عشق کی ناکامی کے روپ میں ڈھال کر غزل کے ادبی معیار اور تغزل کی آبرو کو بچایا گیا، جس سے غزل کی انفرادیت قائم رہی۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

لکھنؤ اسکول کے دور تک پہنچتے پہنچتے غزل کا یہ باطنی رخ کسی حد تک خارجیت میں تو تبدیل ہوا، مگر اس خارجیت کا رخ بھی سیاست یا معیشت کی طرف نہیں تھا بلکہ محبوب کے سراپا، لباس، زیورات اور سطحی جذباتی چنچل پن کی طرف تھا۔ لکھنؤ کی غزل نے زبان کی صفائی اور لفظی صناعی پر تو بہت زور دیا، مگر اس نے بھی غزل کو معاشرتی اور طبقاتی شعور کا ترجمان بننے سے روکے رکھا۔ یہاں بھی 'غمِ جاناں' کی روایتی بالادستی قائم رہی، اگرچہ اس محبوب کا رتبہ ماورائی ہونے کے بجائے نچلے درجے کی دنیاداری اور جنسیت تک گر گیا تھا، لیکن 'غمِ دوراں' اب بھی غزل کے آستانے سے راندۂ درگاہ رہا۔

مرزا اسد اللہ خان غالب کے عہد تک آتے آتے غزل کے اس فکری جمود میں ایک زبردست فکری ارتعاش پیدا ہوا۔ غالب نے غزل کے روایتی موضوعات کو فلسفیانہ اور وجودی گہرائی عطا کی، لیکن انھوں نے بھی غزل کی کلاسیکی حدود کا احترام برقرار رکھا۔ انھوں نے مروجہ سیاسی تحریکوں کو براہِ راست غزل میں جگہ دینے کے بجائے انسان کی مابعد الطبیعیاتی تنہائی، کائنات کی بے ثباتی اور عقل و عشق کے تصادم کو موضوع بنایا۔ غالب کے ہاں بھی 'غمِ جاناں' مادی دنیا کے غبار سے ارفع رہا، اگرچہ ان کے ہاں زمانے کے سرد و گرم کی تپش کلام میں صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ کلاسیکی عہد کے اسی تہذیبی اور فنی رویے کا گہرا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تصنیف میں رقم طراز ہیں:

> "کلاسیکی غزل کا شعری نظام جس تہذیب کی پیداوار تھا، وہاں اجتماعی سچائیوں کو غزل کے پردے میں چھپا کر اور استعاروں کا رنگ چڑھا کر پیش کرنا ہی فن کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی غزل میں معروضی حالات براہِ راست متحرک نظر نہیں آتے بلکہ وہ عشق کے گہرے سوز میں گھل مل کر غزل کی مروجہ روایت کا حصہ بنتے ہیں۔" (۲)

یعنی کلاسیکی دور کی غزل میں معروضی سماجی حقیقت نگاری کی عدم موجودگی کوئی خامی نہیں تھی بلکہ یہ اس دور کا شعوری فنکارانہ انتخاب تھا۔ شاعر اپنے معروضی حالات سے بے خبر نہیں تھا، لیکن وہ غزل کے روایتی جمال اور اس کے پائیدار مابعد الطبیعیاتی مزاج کو وقتی ہنگاموں کی نذر کرنے کا روادار نہ تھا۔ اسی فنی اعتدال اور روایتی احتیاط نے کلاسیکی اردو غزل کو صدیوں تک اپنی ادبی جادوگری اور جمالیاتی کشش برقرار رکھنے میں مدد دی، جس نے بعد کے ادوار کے لیے ایک مضبوط اور باوقار شعری پس منظر تیار کیا۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں برصغیر کا فکری منظر نامہ ایک زبردست نظریاتی انقلاب سے دوچار ہوا

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

جسے تاریخِ ادب میں "ترقی پسند تحریک" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تحریک نے جاگیر دارانہ اقدار، نو آبادیاتی تسلط اور قدیم رومانوی روایات کو چیلنج کرتے ہوئے مادی حقائق اور طبقاتی شعور پر مبنی ادب کی ترویج کا بیڑا اٹھایا۔ ابتدا میں، ترقی پسند نظریہ دانوں نے اردو غزل کو ایک رجعت پسند، فرسودہ اور درباری صنفِ سخن قرار دے کر رد کرنے کی وکالت کی، کیونکہ ان کے نزدیک روایتی 'غمِ جاناں' مادی دنیا کے سنگین مسائل سے غافل کرنے کا ایک اوزار بن چکا تھا۔ لیکن جلد ہی اس انقلابی تحریک کے اہم ترین معماروں اور شعرا کو یہ احساس ہو گیا کہ غزل اردو داں طبقے کی روح میں اس طرح رچی بسی ہے کہ اس سے یکسر قطع تعلق کرنا خود تحریک کے عوامی ابلاغ کو نقصان پہنچائے گا۔ چنانچہ، غزل کو مسترد کرنے کے بجائے اس کے فکری ڈھانچے کی از سرِ نو تعمیر کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے غزل کے بنیادی ستون 'غمِ جاناں' کی نفی نہیں کی، بلکہ اس کی "فکری بازیافت" کا نظریہ پیش کیا، جس کے تحت انفرادی محبت کو اجتماعی شعور کے ارتقاء کا زینہ تسلیم کیا گیا۔

ترقی پسند شعرا نے یہ فکری نکتہ متعارف کروایا کہ ایک انسان کا دوسرے انسان سے محبت کا رشتہ بنیادی طور پر ایک صحت مند اور مخلصانہ رویہ ہے، جو انسان کے اندر دردمندی اور ایثار کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جب یہ رشتہ وسعت اختیار کرتا ہے، تو وہ محض ایک فردِ واحد کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ مظلوم انسانیت، محکوم وطن اور غریب محنت کش طبقے سے محبت کا روپ دھار لیتا ہے۔ یوں، ترقی پسندوں نے 'غمِ جاناں' کو خارج نہیں کیا بلکہ اسے 'غمِ دوراں' کے وسیع تر دھارے میں تحلیل کر کے ایک نئی معنوی بلندی عطا کی۔

اس نئے شعری نظریے کے تحت غزل کا محبوب اب صرف ایک بے نیاز، ظالم اور خیالی ہستی نہیں رہا، بلکہ وہ اپنے اندر ایک تاریخی سچائی، سماجی انصاف اور آزادی کا استعارہ سموئے ہوئے تھا۔ محبوب کی زلف کا پیچ و خم اب محنت کش طبقے کی الجھی ہوئی تقدیر کا عکاس بن گیا، اور رقیب کی چیرہ دستیاں استحصالی نظام اور آمریت کی علامتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ یہ غزل کی تاریخ کا وہ عظیم تخلیقی انقلاب تھا جس نے غزل کو درباری عیش و عشرت سے نکال کر سچی عوامی امنگوں کا ترجمان بنا دیا۔ ترقی پسند تحریک کے اسی فکری ارتقاء اور غزل کی معنوی بازیافت پر بحث کرتے ہوئے ممتاز ترقی پسند ناقد سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

> "ترقی پسند شعرا نے غزل کو محض ایک تفریحی صنف نہیں رہنے دیا، بلکہ انھوں نے غزل کے مروجہ عشقیہ لب و لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے اسے طبقاتی کشمکش کا آئینہ دار بنا دیا۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

انھوں نے یہ ثابت کیا کہ زندگی کے مادی دکھ درد بھی غزل کے تغزل کا حصہ بن سکتے ہیں،
بشرطیکہ جذبے میں اخلاص اور فن پر گرفت مضبوط ہو۔" (۳)

اس فکری بازیافت کی سب سے درخشاں مثال فیض احمد فیض کی شاعری میں ملتی ہے۔ فیض نے "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" کہہ کر نہ صرف روایتی رومانوی غزل سے انحراف کا اعلان کیا، بلکہ ایک نئے رومانوی طرزِ احساس کی داغ بیل ڈالی۔ فیض کے نزدیک اب مادی کائنات کے تلخ حقائق (خاک میں لتھڑے ہوا گوشت، سڑکوں پر بہتا ہوا لہو) اتنے خوفناک اور توجہ طلب ہیں کہ وہ محبوب کی زلفوں کی اسارت میں محصور نہیں رہ سکتے۔ تاہم، ان کی یہ بیزاری محبوب سے نفرت کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ دنیا کے دکھوں کے سامنے انفرادی رومان کی بے بسی کا ایک دردناک اعتراف تھا۔

اس تحریک کے زیرِ اثر غزل کی روایتی لغت کو بھی نئی زندگی ملی۔ "بہار" اب محض ایک موسم کا نام نہیں رہا بلکہ وہ سیاسی تبدیلی اور فلاحی معاشرے کی نوید بن گئی، "خزاں" آمریت اور جمود کا استعارہ ٹھہری، اور "مسیحا" وہ مخلص سیاسی رہنما بنا جو بیمار سماج کے دکھوں کا مداوا کر سکے۔ ان علامتوں کے استعمال سے غزل میں ایک خاص قسم کا فکری ابہام اور حسنِ ابلاغ پیدا ہوا، جس نے قارئین کو نہ صرف جمالیاتی تسکین دی بلکہ ان کے اندر سماجی بیداری بھی پیدا کی۔

ترقی پسند تحریک نے غزل میں داخلیت اور خارجیت کا ایک ایسا پائیدار امتزاج پیش کیا جس نے غزل کو وقتی اور ہنگامی موضوعات کی نذر ہونے سے بچا لیا۔ انھوں نے یہ فہم پیدا کیا کہ حقیقی فنکار کبھی بھی معاشرے سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتا، اور اس کا آرٹ تب ہی سچا اور لافانی بن سکتا ہے جب وہ مٹی کے زخموں کی گواہی پیش کرے۔ اس نظریے نے غزل کو وہ حوصلہ دیا کہ وہ اب دار و رسن کے سایوں میں بھی گنگنا سکتی تھی اور قید خانے کی تنہائی میں بھی سحر کا خواب دیکھ سکتی تھی۔ ترقی پسند غزل کی اسی ہمہ جہت تاثیر اور عصری انفرادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں:

> "ترقی پسند شعرا نے غزل کو جو نیا آہنگ دیا، اس کی بنیاد رومان اور حقیقت کے حسین امتزاج پر رکھی گئی تھی۔ انھوں نے غزل کو خارج سے وہ توانائی دی جس نے غزل کی دم توڑتی ہوئی داخلیت کو نہ صرف نئی زندگی بخشی بلکہ اسے عوامی تحریکوں کی ترجمانی کا لافانی فکری ہتھیار بنا دیا۔" (۴)

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

ڈاکٹر سلیم اختر کا یہ تحقیقی نکتہ اس سچائی کی توثیق کرتا ہے کہ اگر ترقی پسند شعرا غزل کے رومانوی اسلوب یعنی 'غمِ جاناں' کی فکری تجدید نہ کرتے، تو غزل شاید محض ایک فرسودہ تاریخی یادگار بن کر رہ جاتی تھی کیونکہ یہ اپنے عہد سے ٹوٹ چکی تھی۔ انھوں نے غزل کو اپنے عہد کے سنگین مسائل سے جوڑ کر اسے وہ ابدیت عطا کی جو کسی بھی صنف کی بقا کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ غزل نے اب نہ صرف اپنی روایتی چمک برقرار رکھی، بلکہ اس میں وہ انقلابی شعلہ بھی دہک اٹھا جو استحصالی نظام کی بنیادوں کو ہلانے کی جرات رکھتا تھا۔ ترقی پسند تحریک نے غزل کی تاریخ میں 'غمِ جاناں' کی جو فکری بازیافت کی، اس نے اردو شاعری کو ایک نئے سائنسی اور انسانی عروج پر پہنچا دیا۔

اردو کی فکری تاریخ میں جمالیاتی رچاؤ اور انقلابی شعور کا باہمی تصادم ہمیشہ ایک نازک مسئلہ رہا ہے، مگر فیض احمد فیض نے اس تصادم کو ایک تخلیقی آمیزش میں بدل کر اردو غزل کو ایک نئی آبرو بخشی۔ ان کا فن اس فہم پر استوار ہے کہ زندگی کی مادی سچائیاں رومانوی احساس کی تپش کے بغیر بے روح رہتی ہیں، اور رومانوی مٹھاس اگر خارجی حقیقتوں کی تلخی سے فیض یاب نہ ہو تو وہ سطحی ہو جاتی ہے۔ فیض کے کلام کا حسن رومان اور انقلاب کا وہ فنکارانہ ملاپ ہے جہاں عشق کا ہر تجربہ سماج کے درد کو جذب کر کے کائناتی وسعت حاصل کر لیتا ہے۔ فیض کی رومانیت محض محبوب کے وصل کی تمنا نہیں بلکہ ایک عمیق جذباتی کیفیت ہے جو مٹی کی سچی تڑپ سے پھوٹتی ہے۔ ان کے یہاں انقلابی جذبہ بھی کسی خشک نظریاتی پروپیگنڈے کے تحت جنم نہیں لیتا، بلکہ وہ انسانی عظمت اور برابری کی سچی تڑپ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل کے نرم و نازک بحور کو طبقاتی جدوجہد کے تلخ بیانیوں کے لیے منتخب کر کے یہ ثابت کیا کہ غزل کے تغزل کی لطافت کو پامال کیے بغیر بھی مٹی کے دکھوں کی سچی گواہی دی جا سکتی ہے۔

ان کے پہلے مجموعے "نقشِ فریادی" کی نظم "رقیب سے" رومان اور انقلاب کے اسی ادغام کی ایک بہترین اور اچھوتی مثال ہے۔ روایتی اردو غزل میں رقیب ہمیشہ نفرت اور حقارت کا نشانہ رہا ہے، مگر فیض نے اپنے رقیب کو مخلصانہ ہمدردی کے دائرے میں لا کھڑا کیا۔ ان کے نزدیک رقیب بھی اسی محبوب کے حسن کا اسیر رہا ہے جس کی وجہ سے خود شاعر کے دل میں انسانیت کا درد اور کائنات کی سچائیاں بیدار ہوئیں۔ یہ روایتی محبوب کی جفاکاری کو سماجی اور انقلابی شعور میں بدلنے کا پہلا اوزار ثابت ہوا۔ نظم "رقیب سے" کا یہ بند رومانوی رشتوں کے بطن سے انقلابی اور سماجی بصیرت کی پیدائش کو نہایت خوبصورتی سے مجسم کرتا ہے:

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

زیرِ دستی کے ، مصیبت کے تلازم سمجھے
اشک و آہِ رخِ زیبائے دوعالم سمجھے (۵)

اس شعری اقتباس میں فیض نے واضح کیا کہ محبوب کا عشق محض ایک نجی جذبہ نہیں تھا، بلکہ اس نے شاعر کو غریبوں کی حمایت، کمزوروں کے دکھ درد اور سماجی ناانصافی کی تہوں تک پہنچنے کی تحریک دی۔ محبوب کے حسن سے بیدار ہونے والی یہ دردمندی بالآخر ایک ایسے نظریاتی شعور میں ڈھل گئی جس نے فیض کو عمر بھر مظلوموں کی وکالت کرنے پر آمادہ رکھا۔ یہاں عشق کی آفاقیت سماج کی مادی سچائیوں کے ساتھ یک جان ہو کر ایک اعلیٰ فنی مرتبے کو چھوتی ہے۔

فیض کی یہ جمالیاتی آمیزش جب ان کی جیل کی اسیری کے دور میں داخل ہوتی ہے، تو ان کی غزلوں میں ایک نیا علامتی رنگ گہرا ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں مقتل، قفس اور صیاد کی روایتی علامتیں محض سیاسی قید خانے کی عکاس نہیں رہتیں، بلکہ وہ محبوب (آزادی) کی راہ میں دی جانے والی سر فروشی کی لازوال رومانوی داستان بن جاتی ہیں۔ وہ قید کی سخت رات کو محبوب کے فراق کی رات سے تشبیہ دیتے ہیں، جس سے سیاسی قید کا جسمانی کرب ایک لطیف اور دائمی شعری سوز و گداز میں ڈھل جاتا ہے۔ "زنداں نامہ" کی اس غزل کے اشعار رومان اور سیاسی مزاحمت کے اس حسین امتزاج کا ثبوت پیش کرتے ہیں:

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں
جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی تو کوئی بات نہیں (۶)

اس کلام میں ہجر کی نفی اور مقتل کی سر فروشی کو جس رومانوی وقار اور غنائیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، وہ فیض کے اسلوب کی پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ شاعر اپنی مادی تنہائی اور سیاسی اسیری پر گریہ کرنے کے بجائے اپنے نظریاتی عہد پر نازاں نظر آتا ہے۔ مقتل کی راہ پر بڑھتے ہوئے قدموں میں رقصِ شوق کی جو لَے موجود ہے، وہی رومان اور انقلاب کا وہ فنکارانہ امتزاج ہے جو فیض کے کلام کو ہر دور کے مظلوم مسافروں کے لیے ایک ابدی ترانے میں بدل دیتا ہے۔

ان کی انقلابی فکری جڑیں ان کے صوفیانہ تہذیبی پس منظر سے بھی سیر اب ہوتی ہیں۔ فیض کے ہاں حبِ

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

وطن اور طبقاتی یکجہتی کا جذبہ ایک درویشانہ تصوف کی چادر اوڑھے ہوئے نظر آتا ہے۔ وہ اپنی انقلابی فکر کی ترویج کے لیے نعرہ بازی کے بجائے گہرے سکوت، ضبطِ نفس اور قلندرانہ بے نیازی کی زبان بولتے ہیں۔ یہی شائستہ اور متین رویہ ان کی غزلوں کو وقتی خطابت کے زوال سے بچاتا ہے اور ان کے سیاسی نظریات کو ابدیت بخشتا ہے۔ فیض کے اس رومانوی اور اشتراکی فکری نظام کی آمیزش کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے نامور ترقی پسند نقاد اور محقق ممتاز حسین رقم طراز ہیں:

> "فیض کے یہاں عشق اور انقلاب دو متوازی خطوط نہیں بلکہ ایک ہی وحدت کے دو رُخ ہیں۔ وہ مادی دنیا کے طبقاتی تضادات کو بھی غزل کی صوفیانہ اور رومانوی لغت کے ذریعے اس نفاست سے بیان کرتے ہیں کہ ان کی اشتراکیت محض ایک معاشی فلسفہ بننے کے بجائے انسانی درد کا ایک مقدس صحیفہ بن جاتی ہے۔" (۷)

یعنی فیض احمد فیض نے رومان اور انقلاب کو اس طرح یک جان کیا کہ دونوں نظریات ایک دوسرے کی بقا کے ضامن بن گئے۔ انھوں نے غزل کو مادی دنیا کے غبار سے آشنا کر کے اس کی معنویت کو نئی وسعت دی، اور انقلاب کی پکار کو غزل کی چاشنی دے کر اسے ہر دل کی دھڑکن بنا دیا۔

حبیب جالب کا نام سنتے ہی ذہن میں احتجاجی جلسوں، شعلہ بار تقریروں اور آمرانہ قوانین کے خلاف گونجتی ہوئی نظموں کا ایک طاقتور خاکہ ابھرتا ہے۔ تاہم، جالب کی غزلوں کا گہرا تنقیدی مطالعہ اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ ان کے اندر کا انقلابی باغی بنیادی طور پر غزل کی نرم و نازک مٹی سے ہی تراشا گیا تھا۔ جالب نے غزل کے روایتی حسنِ ابلاغ اور محبوب کے نازک پیرائے کو اپنی دھرتی، اپنے پسے ہوئے عوام اور وطن کی آبرومندی کے گیت گانے کے لیے اس مہارت سے استعمال کیا کہ غزل نجی عشقیہ داستان سے نکل کر اجتماعی دکھ سکھ کا خوبصورت مرقع بن گئی۔

جالب کی غزل میں 'غمِ جاناں' اور 'غمِ دوراں' دو الگ متصادم دنیائیں نہیں ہیں بلکہ ایک ایسی قلندرانہ داخلیت میں گھل مل گئے ہیں جہاں وطن ہی محبوب کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ انھوں نے غزل کے کلاسک روپ کو توڑا نہیں، بلکہ اس روپ کے پیچھے چھپے ہوئے استعارات کو ایک پُر سوز عوامی تشخص بخشا۔ ان کے نزدیک محبوب سے بچھڑنے کا دکھ اور وطن پر مسلط استحصالی قوتوں کا دکھ ایک ہی دائرۂ احساس کی دو مختلف تہیں ہیں، جنہیں جالب نے غزل کے دھیمے ترنم کے ساتھ ادا کیا۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

جالب نے اپنے مجموعے "گوشے میں قفس کے" میں قید خانے کی تنہائی اور حبِ وطن کو غزل کے روایتی غنائی اسلوب میں پیش کیا۔ ان کی غزلوں میں جو اداسی اور کرب پایا جاتا ہے، وہ کسی فرضی جدائی کا رنج نہیں بلکہ آمرانہ دور میں عوام کی آنکھوں میں پھیلے ہوئے آنسوؤں کی عکاسی ہے۔ جب وہ روایتی محبوب کی بھیگی آنکھوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا اشارہ دراصل ان ماؤں، بہنوں اور دکھی عوام کی طرف ہوتا ہے جو جبر کی چکی میں پس رہے ہیں۔ "گوشے میں قفس کے" سے منتخب یہ اشعار غزل کے رومانوی دائرے میں ستم زدہ عوام کی خاموش ترجمانی کی ایک عمدہ مثال پیش کرتے ہیں:

تیری بھیگی ہوئی آنکھیں ہیں مجھے یاد اب تک
تو اسی طرح خیالوں میں ہے آباد اب تک
آنسوؤں پر وہی پہرے ہیں ستم گاروں کے
وہی ہونٹوں پہ ہے سہمی ہوئی فریاد اب تک (۸)

اس شعری اقتباس میں جالب نے غزل کے مانوس الفاظ "بھیگی آنکھیں"، "یاد"، "آباد" اور "ستم گار" کو بڑی چابکدستی سے سیاسی اسیری اور عوامی جبر کے پس منظر میں برتا ہے۔ ستم گاروں کے پہرے اور سہمی ہوئی فریاد کا تذکرہ کر کے انھوں نے روایتی ہجر کو آمریت کے سنگین دور میں عوام کی سلب شدہ آزادیوں کا استعارہ بنا دیا ہے۔ یہی وہ فنکارانہ لمس ہے جو جالب کو محض ایک نعرہ باز شاعر کے بجائے ایک حساس غزل گو کے مرتبے پر فائز کرتا ہے۔

جالب کا وطن دوستی کا نظریہ کسی جغرافیائی حد کا محتاج نہیں تھا بلکہ وہ مٹی کی خوشبو اور اس کے باسیوں کے تقدس پر یقین رکھتے تھے۔ ان کی غزلوں میں وطن ایک ایسی پُر جمال محبوبہ کے روپ میں ابھرتا ہے جس کا سنگھار ظلم کے تھپیڑوں نے بگاڑ دیا ہے۔ جالب اس "پری جمال" محبوبہ کے زخموں کو سہلاتے ہیں، اس کی پامالی پر کڑھتے ہیں اور اپنے جنونِ وفا کے ذریعے اس کی بہاروں کی بازیابی کا عہد کرتے ہیں۔ ان کی غزل دھرتی ماں کی اسی دلداری کا خوبصورت اظہار ہے۔ مجموعہ کلام "عہدِ سزا" کی اس غزل میں جالب نے وطن کے ساتھ اپنے اسی قلندرانہ عشق اور سچے جنونِ وفا کو شعر کا پیرہن عطا کیا ہے:

جنوں کے بس میں ہے میرا پری جمال وطن
وہ ظلم اس پہ ہوئے ہیں کہ ہے نڈھال وطن

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

اسے رہائی ملے تو مری رہائی ہو
ازل سے ہے میری صورت خراب حال وطن (۹)

یعنی جالب کے نزدیک جب تک ان کا وطن استحصالی قوتوں کے شکنجے سے آزاد نہیں ہو جاتا، تب تک ان کی اپنی ذات کا اضطراب اور بکھراؤ ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ غزلیں ثابت کرتی ہیں کہ جالب نے غزل کی روایتی بزم کو بزمِ وطن میں تبدیل کر کے اردو غزل کو ایک نئی فکری عظمت دی ہے۔ جالب کا غزل گو اسلوب اس لیے بھی اہم ہے کہ انھوں نے غزل کے مروجہ صوتی آہنگ اور ترنم کو اپنی بیباک آواز کی گونج کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ ان کے کلام میں وہ درویشانہ غنائی لے موجود ہے جو سننے والے کو فوری طور پر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ وہ مشکل تراکیب کے بغیر بھی عام فہم مٹی کے الفاظ سے وہ ترنم پیدا کرتے ہیں جو مشاعروں سے نکل کر بازاروں اور سڑکوں کی صدا بن جاتا ہے۔ ان کی غزل کا یہی پُر تاثیر کھرا پن ان کے معاصرین میں مفقود نظر آتا ہے۔ جالب کی غزل کی اسی ندرت، عوامی ہمدردی اور اسلوبیاتی قوت کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے ممتاز محقق اور نقاد احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں:

> "جالب ترقی پسند تحریک کی پیداوار تھا مگر اس کی غزل اس فکری اور فنی سادگی کی علمبردار ہے جو نعرہ بنے بغیر بھی دلوں میں انقلاب پیدا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اس نے محبوب کے استعارے کو دھرتی اور عوام کے دکھوں کی شفا بنا کر پیش کیا اور غزل کو کچے گھروں کی سچی ترجمان بنا دیا۔"(۱۰)

جالب کی غزل کا حسن اس کی مقصدی دیانتداری میں چھپا ہوا ہے۔ جالب نے کبھی بھی غزل کے دربار میں جھوٹے قصیدے نہیں لکھے اور نہ ہی مصلحت پسند رومان پرستی کو اپنا شعار بنایا۔ انھوں نے غزل کو مٹی کے کچے گھروں کے مکینوں کی آہوں اور ان کی جدوجہد کا سچا آئینہ بنا دیا۔ ان کی غزلوں میں دھرتی کی دلداری کا یہ روپ اردو ادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا ایک نایاب تخلیقی واقعہ ہے۔ حبیب جالب کی غزل اردو شاعری کے کینوس پر ایک منفرد اور جرات مندانہ تجربہ ہے۔ انھوں نے غزل کے روایتی عشقیہ حصار کو توڑے بغیر اس کے اندر عوامی دکھ سکھ، دھرتی کی تڑپ اور حریتِ فکر کی روح پھونک دی ہے۔

اردو شاعری میں فکری تنوع اور تہذیبی دائرہ کار کو وسعت دینے میں مولانا کوثر نیازی کا مقام نہایت منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ وہ بیک وقت ایک زیرک سیاست دان، جاندار خطیب، مذہبی عالم اور نہایت حساس غزل گو شاعر تھے۔ ان کی غزلوں کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے روایتی مضامین سے ہٹ کر اپنے عہد کے "تہذیبی

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

زوال" اور "اخلاقی انحطاط" کو اپنی شاعری کا مرکزی محور بنایا۔ کوثر نیازی کے ہاں غزل محض محبوب کے روپ کی ستائش کا نام نہیں، بلکہ وہ معاشرتی زوال کے خلاف ایک پُر درد مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی احتجاج بن جاتی ہے۔

کوثر نیازی کی فکری تربیت چونکہ اسلامی علوم، عربی و فارسی کلاسیکی ورثے اور مشرقی اقدار کے سایے میں ہوئی تھی، اس لیے وہ معاشرے میں رونما ہونے والے مادی تغیرات اور اخلاقی گراوٹ کو بڑی باریک بینی سے محسوس کرتے تھے۔ ان کی غزل کا 'غمِ جاناں' دراصل ان کھوئی ہوئی پاکیزہ روایات کا ماتم ہے جو کبھی ہمارے تہذیبی وجود کا فخر ہوا کرتی تھیں۔ ان کے کلام میں وہ کرب صاف محسوس کیا جا سکتا ہے جو ایک سچے تہذیبی انسان کو اپنے ہی سماج کی اخلاقی شکست و ریخت پر ہوتا ہے۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ "زرِ گل" اس فکری سوز اور نظریاتی رچاؤ کی ابتدائی گواہی فراہم کرتا ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں میں انھوں نے مروجہ سیاسی مفاد پرستی، انسانوں کے دوہرے معیار اور مادیت پرستی کے غالب رجحان پر گہرا افسوس ظاہر کیا ہے۔ ان کے نزدیک مادی لذتوں کی اسیر دنیا کبھی بھی سچے عشق اور وفاداری کے اعلیٰ اخلاقی معیاروں پر پوری نہیں اتر سکتی۔ اسی لیے ان کے اشعار میں عیش و عشرت سے گریز اور غم کو گلے لگانے کا صوفیانہ رویہ غالب نظر آتا ہے۔ "زرِ گل" کی اس غزل میں کوثر نیازی نے مادی ہوس کے مقابل درویشانہ عشق کی قلندرانہ اور اخلاقی بالادستی کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے:

عیش و عشرت کے تقاضوں سے گریزاں رہنا
رسمِ عشاق ہے وقفِ غمِ جاناں رہنا
چند دن اور اگر حالِ زمانہ ہے یہی
سخت دشوار ہے انساں کا انساں رہنا (۱۱)

ان کے دوسرے شعری مجموعے "لمحے" تک پہنچتے پہنچتے ان کا یہ تہذیبی شعور مزید پختہ اور تلخ سچائیوں کا عکاس ہو جاتا ہے۔ چونکہ کوثر نیازی اقتدار کی غلام گردشوں کا حصہ رہے اور انھوں نے سیاست کی بے رحمی اور منافقت کو بہت قریب سے دیکھا، اس لیے ان کی غزلوں میں دہرے کرداروں پر کڑا طنز ملتا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ سماجی رشتوں میں اب اخلاص ختم ہو چکا ہے اور ہر چہرہ دوسرے چہرے کو محض اپنے سیاسی یا مادی فائدے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ مجموعہ "لمحے" کی اس غزل کے اشعار میں سماجی تضادات، مفاد پرستی اور انسانی رشتوں کی خستگی کا نہایت جاندار منظر نامہ پیش کیا گیا ہے:

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

جو ہم خیال نہ تھا اب وہ ہم مزاج بھی ہے
قدم قدم پہ مگر امتحان آج بھی ہے
خدا سے مانگ ہی لیں گے تجھے ، مگر ہم نے
خدا کے بعد سنا ہے کوئی سماج بھی ہے (۱۲)

ان ابیات میں کوثر نیازی نے سماج کی بے حسی اور ظالمانہ حد بندیوں کو نشانہ بنایا ہے، جو انسان کی جائز خواہشات اور مخلصانہ جذبوں کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتی ہیں۔ "ہم مزاج" ہو جانے کے باوجود قدم قدم پر امتحان کا ہونا اس سماجی بے اعتمادی کی عکاسی کرتا ہے جس نے انسان کو اپنے ہی قریبی دوستوں سے خائف کر دیا ہے۔ ان کی غزلوں کا یہ فکری رخ روایتی عاشقی سے ہٹ کر ایک نہایت حساس اور سچائی پر مبنی سماجی دستاویزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

کوثر نیازی کا اسلوبیاتی کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان تلخ سیاسی اور تہذیبی موضوعات کو غزل کے نازک سانچے میں ڈھالتے ہوئے کبھی بھی خطابت کا شور پیدا نہیں ہونے دیا۔ ان کے لہجے میں صوفیانہ دھیما پن اور علمائے حق کا سا جلال ایک ساتھ جلوہ گر رہتا ہے۔ وہ اپنے دور کے انحطاط پر آنسو بہانے کے بجائے اس کے اسباب پر فکری گفتگو کرتے ہیں۔ یہی متانت اور شائستگی ان کے شعری لہجے کو اردو ادب کی کلاسیکی روایت کا تسلسل ثابت کرتی ہے۔ ان کے اسی تہذیبی سوز، فکری ارتقاء اور غزل گوئی کے فنی محاسن کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں:

> "مولانا کوثر نیازی کی شاعری میں غزل کی کلاسیکی شان برقرار رہنے کے باوجود اخلاقی زوال کا درد نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں جس سلیقے سے دورِ حاضر کی منافقت اور تہذیبی شکست کی تصویریں کھینچی ہیں، وہ ان کے پختہ تخلیقی جوہر کی عکاسی کرتی ہیں۔" (۱۳)

ڈاکٹر سلیم اختر کا یہ تبصرہ کوثر نیازی کی غزل کے اصل معنوی جوہر کو آشکار کرتا ہے۔ ان کی شاعری محض اپنے جذبات کا کتھارسس نہیں، بلکہ ایک مکمل تہذیبی تشخص کو بچانے کی فکر مند کوشش ہے۔ انھوں نے غزل کے روایتی مے خانے کو اخلاقی اور فکری تربیت گاہ میں تبدیل کر دیا، جہاں قاری کو نہ صرف غزل کی مٹھاس ملتی ہے بلکہ اپنے اندر کے انسان کو زندہ رکھنے کا حوصلہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ مولانا کوثر نیازی کی شاعری اردو ادب میں مٹتی ہوئی تہذیبی اور اخلاقی اقدار کا سب سے معتبر اور بلیغ نوحہ ہے۔ انھوں نے اپنی سیاسی جاہ و حشمت کے درمیان بھی اپنے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

قلم کے وقار اور تہذیبی ورثے کی پاسداری کی۔

جدید اردو شاعری کے منظرنامے پر فخر زمان کا شعری وجود ایک بالکل انوکھے، باغیانہ اور ندرت پسند رویے کی نمائندگی کرتا ہے۔ انھوں نے غزل کے روایتی موضوعات کو خیرباد کہہ کر جدید مادی دنیا کے سب سے سنگین المیے یعنی "وجودی تنہائی" اور پاکستان کے "ہنگامی سیاسی بحرانوں" کو اپنا موضوع بنایا۔ فخر زمان کی غزلوں کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ فرد کی باطنی بیگانگی اور خارج کے سیاسی ہنگاموں کے درمیان پائے جانے والے گہرے تضاد کو نہایت آرٹسٹک انداز میں مجسم کرتی ہیں، جس سے غزل کو ایک نیا اور جدید فکری افق حاصل ہوتا ہے۔

فخر زمان چونکہ خود سیاست اور سماجی تحریکوں کے عملی کردار رہے ہیں، اس لیے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ جدید دور کا سیاسی کارکن کس قدر نفسیاتی اور ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ ان کے کلام میں وہ وجودی تھکن صاف دکھائی دیتی ہے جو مسلسل سیاسی جدوجہد، خوابوں کی شکست، اور دوستوں کے بدلتے ہوئے چہروں کے صدمے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں کا عاشق کوئی روایتی صحرانورد نہیں بلکہ جدید شہر کی سنگلاخ سڑکوں پر سرگرداں وہ پڑھا لکھا انسان ہے جو ہر موڑ پر اپنی شناخت کھو دینے کے خوف سے دوچار ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "راستے کی دھول" ان کے اسی متبادل اور جدید ترین فکری رویے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں میں انھوں نے لفظ "دھول" کو انسانی بے ثباتی اور سیاسی تذلیل کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ دکھاتے ہیں کہ مادی نظام میں انسان کی حیثیت راستے کی دھول جیسی ہو کر رہ گئی ہے، لیکن اس دھول کے ذرات میں اب بھی ایک چنگاری باقی ہے جو کسی بھی وقت ایک طوفان بن کر ابھرنے کی جرات رکھتی ہے۔ "راستے کی دھول" سے منتخب یہ غزل عصری سماجی منافقت، خود اذیتی، اور خوابوں کی پامالی کے گہرے المیے کو نہایت جاندار پیرائے میں آشکار کرتی ہے:

بڑی ہی چاہ تھی جن کی گلے کا ہار ہوئے
جو دل نواز تھے پہلے وہ دل پہ بار ہوئے
گناہ خود ہی کیا خود کو پھر سزا دے لی
ہم اپنے ہاتھوں کئی بار سنگسار ہوئے (۱۴)

فخر زمان کی غزلوں میں یہ احساسِ جرم بار بار ابھرتا ہے کہ انسان اپنی عارضی مصلحتوں اور سیاسی فریب کاریوں کے باعث خود اپنے ہی اصولوں اور خوابوں کو اپنے ہاتھوں قتل کرتا رہتا ہے۔ ان کی یہ ملامت پسند داخلیت غزل کو ایک بالکل نیا نفسیاتی رخ دیتی ہے جو اردو شاعری میں نایاب ہے۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

فخر زمان کی غزلوں کا دوسرا نمایاں پہلو ان کی جدید علامتی حسیت ہے۔ ان کے کلام میں "آئینہ"، "کٹی ہوئی زبانیں"، "سوراخ دار جیبیں"، اور "سنگسار ہونا" ایسے استعارے کثرت سے ملتے ہیں۔ وہ آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھنے سے ڈرتے ہیں، کیونکہ انھیں پتا ہے کہ مادی دنیا کی منافقت نے ان کے اصل چہرے کو مسخ کر دیا ہے۔ یہ وجودی بحران ان کی ہنگامی سیاست سے جڑا ہوا ہے، جہاں وہ دیکھتے ہیں کہ سچ بولنا سب سے بڑا گناہ بن چکا ہے اور جھوٹ کے بازار میں ہر سچی آواز گلا گھونٹ کر مار دی گئی ہے۔ فخر زمان کے شعری مجموعے "زہراب" سے لیا گیا یہ بند جدید عہد میں انسانی عظمت کے کھوکھلے دعووں اور اندرونی بکھراؤ پر ایک کاری اور تیکھا طنز پیش کرتا ہے:

سینہ تو ہے کچلے ہوئے جذبات کا مدفن
چہرے پہ مہکتے ہوئے پھولوں کی لڑی ہے
انسان کو تو جینے کا سلیقہ نہیں آتا
اور آپ کو انسان کی عظمت کی پڑی ہے (۱۵)

فخر زمان کا یہ بے باک لہجہ اردو غزل کو روایتی عشق و عاشقی کے دائرے سے نکال کر دورِ حاضر کی سب سے تلخ اور سنگین فکری بحثوں کا حصہ بنا دیتا ہے۔ فخر زمان کے کلام کی فنی خوبی ان کی غزلوں کی وہ منفرد غنائیت ہے جو روایتی نغمگی کے بجائے ایک تلخ اور کٹے پھٹے ردھم کی حامل ہے۔ ان کی بحور کا انتخاب اور الفاظ کی تراش خراش ان کے باغیانہ خیالات سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔ وہ غزل کے ردیف و قافیہ کو محض ضابطے کی پاسداری کے لیے نہیں برتتے، بلکہ ان کے ذریعے ایک ایسی آواز پیدا کرتے ہیں جو قاری کے ذہن کو سکون دینے کے بجائے اسے بیدار کرتی ہے اور اسے اپنے وجود پر سوال اٹھانے پر مجبور کرتی ہے۔ فخر زمان کی شاعری میں موجود اسی جدید وجودی کرب اور سیاسی تضادات کی فکری حقیقت کو نمایاں کرتے ہوئے ممتاز محقق اور نقاد ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> "فخر زمان کی غزل روایتی غزل سے یکسر مختلف ہے۔ ان کے یہاں جدید شہر کا پھیلتا ہوا جنگل، فرد کی وجودی تنہائی اور ہنگامی سیاست کا تضاد مل کر ایک ایسی شعری کائنات تشکیل دیتے ہیں جہاں خوابوں کی شکست کی کڑواہٹ تو ہے، مگر سچائی کے ساتھ کھڑے ہونے کا حوصلہ اب بھی مفقود نہیں ہوا ہے۔" (۱۶)

ڈاکٹر انور سدید کا یہ تجزیہ فخر زمان کے شعری مقام کا سچا اعتراف ہے۔ ان کی غزلیں ایک ایسے انسان کی دستاویزی شہادت ہیں جو جدید مادی اور مشینی دور کے المیوں سے پوری طرح باخبر ہے۔ انھوں نے ثابت کیا کہ غزل

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

کے روایتی عشقیہ پیرائے میں بھی آج کے دور کی سب سے پیچیدہ وجودی، نفسیاتی اور سیاسی بحثوں کو کامیابی کے ساتھ سمویا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ فکری اور اسلوبیاتی تجربہ جدید اردو غزل کے ارتقاء میں ایک ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اردو شاعری میں زبان و بیان کا تخلیقی برتاؤ اور عروضی تقاضوں کی پاسداری اس کے فنی استحکام کی ضامن ہوتی ہے۔ جب مادی اور سیاسی نظریات غزل کے روایتی قالب میں داخل ہوتے ہیں، تو لسانی تشکیلات اور عروضی سانچے محض ایک تیکنیکی ضرورت نہیں رہتے، بلکہ وہ گہرے سیاسی و جمالیاتی تلازموں کے اظہار کا موثر ترین وسیلہ بن جاتے ہیں۔ پاکستانی سیاست دانوں کی شعری نگارشات کا لسانی مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے ردیف، قافیے اور بحر کے روایتی صوتی اثرات کو اپنے انقلابی نظریات کی تبلیغ اور جمالیاتی رچاؤ کے لیے کمالِ مہارت سے استعمال کیا۔

ردیف ان شعرا کے ہاں ایک مستقل جذباتی اور فکری ارتعاش پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ روایتی غزل میں ردیف رومانوی فضا کو گہرا کرتی تھی، لیکن ان سیاست دان شعرا نے ایسی ردیفوں کا انتخاب کیا جو قاری کے ذہن پر سیاسی بیداری کا کام کرتی ہیں۔ ردیف کی مسلسل صوتی تکرار استبدادی قوتوں کے خلاف ایک اعلانیہ احتجاج بن جاتی ہے، جو ہر شعر کے ساتھ قاری کے جذبات کو بیدار کرتی ہے اور اسے ایک مخصوص سیاسی فکر کی سمت مائل کرتی ہے۔ فیض احمد فیض کے ہاں ردیف کا استعمال دھیمے اور مسلسل اثر انگیزی کا ہے۔ وہ اکثر طویل، مترنم اور نرم صوتی اثرات رکھنے والی ردیفیں چنتے ہیں، جیسے "عذاب آئے"، "شراب آئے"، یا "بات نہیں"۔ یہ ردیفیں ایک طرف تو کلاسک تغزل کا حسن برقرار رکھتی ہیں اور دوسری طرف ان کے پردے میں زمانے کا شدید ترین عذاب چھپا ہوتا ہے۔ صوتی رچاؤ اور سیاسی المیے کا یہ فنکارانہ توازن فیض کے اسلوب کا خاصہ ہے۔ "دستِ صبا" کی اس مشہور غزل میں فیض نے ردیف "آب آئے" اور "عذاب آئے" کے صوتی تلازموں کے ذریعے ذاتی رومان اور اجتماعی سیاسی المیے کو نہایت لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے:

آئے کچھ ابر، آئے کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے
عمر کے ہر ورق پہ تیرا نام
تیری بزمِ طلب میں کیا نہ رہے؟ (۱۷)

اس شعری اقتباس میں "ابر"، "شراب" اور "عذاب" کے قافیے اور ردیف کی تکرار ایک ایسی غنائی

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

فضا پیدا کرتی ہے جہاں ذاتی انبساط اور ملکی حالات کی ستم ظریفی یک جان ہو جاتے ہیں۔ فیض نے عروضی اوزان کے اندر رہتے ہوئے صوتی اثرات سے وہ کام لیا ہے جو سیدھے قاری کے لاشعور میں اتر جاتا ہے اور اسے حسیاتی سطح پر اس عہد کے سیاسی اور مادی عذابوں کا احساس دلاتا ہے۔ یہ عروضی نفاست غزل کے ادبی مرتبے کو مزید بلند کرتی ہے۔

دوسری جانب حبیب جالب کی غزلوں اور نظموں میں ردیف اور قافیے کا برتاؤ بالکل مختلف، عوامی اور نعرے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جالب ایسی ردیفوں کا انتخاب کرتے ہیں جو مقتدرہ سے براہِ راست سوال کرتی ہیں یا ان کے اقدامات پر طنز کرتی ہیں، جیسے "تم کہو" یا "میں نہیں مانتا"۔ جالب کی یہ تشکیلات مشاعروں کے مجمع کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں، جہاں ردیف کی صوتی تکرار ایک اجتماعی سیاسی احتجاج کی آواز بن جاتی ہے۔ جالب کے مجموعے "سرِ مقتل" کی اس غزل میں ردیف "تم کہو" کا سوالیہ صوتی تلازمہ استبدادی نظام اور حکمرانوں کی جھوٹی خوشحالی کے غبار کو اس طرح تار تار کرتا ہے:

چاک سینوں کے سلنے لگے؟ تم کہو!
جام رندوں کو ملنے لگے؟ تم کہو!
وہ جو دیوارِ زنداں تھی، اب گر گئی؟
ہاتھ پاؤں ابلنے لگے؟ تم کہو! (۱۸)

اس شعری ٹکڑے میں "سلنے لگے"، "ملنے لگے" اور "ابلنے لگے" کے قوافی اور ردیف "تم کہو" کا سوالیہ آہنگ مقتدر طبقات کی بنائی گئی مصنوعی بہار پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ یہ جالب کا وہ منفرد عروضی ہنر ہے جہاں وہ غزل کی بحر کی روانی کو ایک عوامی گیت کے ردھم میں تبدیل کر دیتے ہیں، تاکہ عام سے عام انسان بھی اس صوتی ترنم کا حصہ بن کر اپنے اندر سیاسی بیداری کو محسوس کر سکے۔

ان شعرا کے ہاں علامات اور استعارات کا لسانی استعمال بھی گہرے تہذیبی اور سیاسی معانی کا امین ہے۔ کلاسیکی شاعری میں "رقیب"، "محتسب"، "واعظ" اور "صیاد" کی علامتیں اخلاقی یا رومانوی تصادم کو ظاہر کرتی تھیں، مگر ان سیاست دان شعرا نے ان علامتوں کو طبقاتی کشمکش کا ترجمان بنا دیا۔ مہرِ تاباں اور نویدِ سحر اب محض صبحِ نو کا منظر نہیں، بلکہ وہ استحصالی قوتوں کے خاتمے اور سچے اشتراکی سماج کے طلوع ہونے کی علامت بن جاتے ہیں۔ علامات کا یہ لسانی ارتقا غزل کی نظریاتی اساس کو مضبوط کرتا ہے۔ غزل کے انھی اسلوبیاتی آلات، صوتی تلازموں اور لسانی عروضی فارمولوں کا باریک بین اسلوبیاتی تجزیہ پیش کرتے ہوئے نامور ماہرِ لسانیات اور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

رقم طراز ہیں:

> "جدید سیاسی اور ترقی پسند غزل میں ردیف اور قافیہ صرف عروضی ضرورتیں نہیں ہیں، بلکہ یہ وہ صوتی اور اسلوبیاتی محرکات ہیں جو کلام کی معنوی تہوں کو کھولتے ہیں۔ ان شعرا نے صوتی آہنگ کے ذریعے ایک ایسا متوازی لسانی نظام وضع کیا جہاں ہر روایتی لفظ اپنے اندر ایک نیا انقلابی اور جمالیاتی تلازمہ سموئے ہوئے ہے۔" (۱۹)

یعنی یہ سیاست دان شعرا علمِ عروض کے تمام رموز سے کماحقہ واقف تھے، اس لیے ان کی علامتی تراش خراش کبھی بھی بے وزن یا غیر مربوط محسوس نہیں ہوتی۔ انھوں نے مادی نظریات کی تبلیغ کے لیے زبان کا استحصال نہیں کیا، بلکہ زبان کے حسن اور عروضی قوانین کا احترام کرتے ہوئے اپنے کلام کو معنوی اور صوتی ہم آہنگی کی معراج تک پہنچایا۔ متذکرہ پاکستانی سیاست دانوں کی شعری تخلیقات میں ردیف، قافیہ، بحر اور علامات کا برتاؤ ان کی خلاقانہ صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انھوں نے فن اور فکر کے بہترین توازن کے تحت غزل کو ایک نیا اور توانا ڈکشن (Diction) عطا کیا۔ ان کی یہ لسانی اور عروضی تشکیلات اردو غزل کی تاریخ کا وہ بیش بہا سرمایہ ہیں جس نے غزل کو مادی اور معروضی سچائیوں کا سب سے مقبول، مترنم اور پائیدار عکاس بنا دیا۔

معاصر اردو غزل کے فکری اور فنی خدوخال کا اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے، تو یہ حقیقت پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ اس پر 'غمِ جاناں' اور 'غمِ دوراں' کے امتزاج کے گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں جنم لینے والا یہ تخلیقی تجربہ، جس کی آبیاری مقتدر سیاست دانوں اور انقلابی شعرا نے اپنے خونِ دل سے کی، آج کی غزل کا بنیادی ضابطۂ فہم بن چکا ہے۔ موجودہ دور کا شاعر اب غزل کو محض ایک مابعد الطبیعیاتی یا ماورائی صنف نہیں سمجھتا، بلکہ وہ اسے اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور نفسیاتی حقیقتوں کا سب سے معتبر آئینہ دار تسلیم کرتا ہے۔

اس فکری آمیزش کا سب سے پہلا دوررس اثر یہ ہوا کہ معاصر غزل نے اپنے روایتی فرار پسندانہ رویے کو یکسر ترک کر دیا۔ کلاسیکی عہد کی غزل جہاں مادی دنیا کے سنگین تقاضات سے آنکھیں چرا کر محبوب کے خیالی کوچے میں پناہ تلاش کرتی تھی، وہیں معاصر غزل حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سچ بولنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ آج کی غزل کا عاشق محض ہجر کی راتوں پر رونے والا مسافر نہیں، بلکہ وہ اپنے عہد کے سیاسی جمود، طبقاتی ناانصافی اور سلب شدہ شہری آزادیوں کے خلاف برسرِپیکار ایک باشعور شہری ہے۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

معاصر غزلیہ لغت پر اس امتزاج کے اثرات نہایت گہرے ہیں۔ ان سیاست دان شعرا نے روایتی علامتوں کو جو نئی سیاسی معنویت بخشی تھی، وہ اب معاصر غزل کے تخلیقی لاشعور کا مستقل حصہ بن چکی ہے۔ آج جب کوئی شاعر اپنی غزل میں 'دار و رسن'، 'صیاد'، 'بہار' یا 'دیوارِ زنداں' کے الفاظ استعمال کرتا ہے، تو قاری کو اس کے پیچھے کسی روایتی بزم کا نقشہ نظر نہیں آتا، بلکہ اسے اپنے ملک کے معروضی سیاسی حالات، آمریت کی تاریخ اور انسانی حقوق کی جدوجہد یاد آجاتی ہے۔ زبان کو یہ معنوی وسعت اسی فکری سنگم کی مرہونِ منت ہے۔ معاصر غزل کے اسی فکری ارتقاء اور مزاحمتی تشخص پر روشنی ڈالتے ہوئے نامور محقق اور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> "معاصر اردو غزل نے فیض کی جمالیاتی دردمندی اور جالب کی بیباک عوامی احتجاج سے جو فیض پایا ہے، اس نے غزل کو مادی زندگی کا سب سے سچا ترجمان بنا دیا ہے۔ آج کا غزل گو شاعر انفرادی رومان کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے سیاسی المیوں کو اس نفاست سے بیان کرتے ہیں کہ غزل کی غنائیت بھی قائم رہتی ہے اور احتجاج کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے۔"(۲۰)

موجودہ دور کے تخلیق کار نے یہ فن سیکھ لیا ہے کہ کس طرح اپنے سیاسی اور سماجی نظریات کو غزل کی چاشنی میں ڈبو کر پیش کیا جائے، تاکہ کلام نری نعرہ بازی بن کر اپنی ادبی اہمیت نہ کھو بیٹھے۔ غزل کی داخلیت اب خارجیت کی سنگینی کے ساتھ اس طرح یک جان ہو چکی ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس امتزاج کا ایک اور نمایاں اور تعمیری اثر غزل کے نسوانی اور معروضی کرداروں کی تبدیلی میں نظر آتا ہے۔ معاصر غزل کا محبوب اب محض ایک خاموش، جفاکار اور سنگدل پیکر نہیں رہا، بلکہ وہ زندگی کی جدوجہد میں عاشق کے شانہ بشانہ کھڑا ایک فعال کردار ہے۔ خواتین غزل گو شعرا نے بھی اس فکری ملاپ سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے، جہاں ان کی غزلوں میں انفرادی محبت کے دکھ کے ساتھ ساتھ پدرشاہی نظام، سماجی ناانصافی اور سیاسی جبر کے خلاف ایک توانا نسوانی احتجاج گونجتا دکھائی دیتا ہے۔

مزید برآں، معاصر غزل نے اس فکری ادغام کے زیرِ اثر جدید دور کی وجودی تنہائی اور نفسیاتی بحرانوں کو بھی اپنے اندر جذب کیا ہے۔ آج کا انسان مادی ترقی کے باوجود جس باطنی کھوکھلے پن، شناخت کے بحران اور بیگانگی کا شکار ہے، غزل ان پیچیدہ احساسات کو نہایت خوبصورتی سے علامتی پیرائے میں بیان کر رہی ہے۔ فخر زمان کی غزلوں میں پایا جانے والا وجودی کرب اور سیاسی مایوسی کا جو رنگ تھا، وہ اب معاصر غزل کے جدید ترین اسلوب کی پہچان بن

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

چکا ہے۔ غزل کی اسی لچک پذیری، معنوی وسعت اور اس کی دائمی بقا کے راز کا اعتراف کرتے ہوئے ممتاز مؤرخ اور نقاد ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

> "اردو غزل کی بقا کا راز ہی اب اس بات میں پنہاں ہے کہ وہ محض روایتی حسن و عشق کے دائروں میں قید رہنے کے بجائے عصری سچائیوں اور مادی زندگی کے چیلنجز کو اپنی آغوش میں سموئے رکھے۔ جس غزل نے رومان اور مادی حقیقتوں کے اس نامیاتی ربط کو قبول کر لیا، وہی دراصل ہمارے عہد کا زندہ اور پائیدار ادب ہے۔"(۲۱)

معاصر غزل کا اسلوبیاتی مطالعہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اب مادری زبانوں اور لوک ثقافت کے اثرات غزل کے روایتی اسلوب پر حاوی ہو رہے ہیں۔ جالب کے عوامی رنگ اور فخر زمان کی پنجابی ثقافتی جڑوں کے زیر اثر، معاصر غزل گو شعرا اب روزمرہ کی سادہ زبان، لوک گیتوں کے ردھم اور دیسی تشبیہات کو غزل کا حصہ بنا رہے ہیں۔ اس سے غزل کا درباری اور مصنوعی پن ختم ہو گیا ہے اور اس میں مٹی کی وہ سچی مہک رچ بس گئی ہے جو قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس فکری ملاپ نے معاصر غزل کو یہ حوصلہ بھی دیا کہ وہ ہر دور کے آمرانہ ہتھکنڈوں کے خلاف صف آرا ہو سکے۔ پاکستان کے موجودہ سیاسی منظرنامے میں جب بھی سنسر شپ، سلبِ آزادی، اور سیاسی بحران سر اٹھاتے ہیں، تو معاصر غزل گو شعرا کا قلم خود بخود فیض اور جالب کی اسی مزاحمتی لے پر چلنے لگتا ہے جو انھوں نے ورثے میں پائی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ امتزاج محض ایک عارضی رجحان نہیں تھا بلکہ یہ معاصر غزل کی بقا اور اس کی اخلاقی جرات کا ناگزیر محور بن چکا ہے۔

ان تمام مباحث، تاریخی شواہد اور تنقیدی جائزوں کی روشنی میں یہ محاکمہ بالکل درست اور مبنی بر حقیقت قرار پاتا ہے کہ 'غمِ جاناں' اور 'غمِ دوراں' کے امتزاج نے معاصر اردو غزل کو ایک نئی فکری عظمت، اسلوبیاتی تنوع، اور لافانی مقبولیت عطا کی ہے۔ ان سیاست دان شعرا کی یہ فکری وراثت آج کی غزل کا وہ روشن اثاثہ ہے جس نے غزل کو محض دل لگی کا ذریعہ بننے سے بچا کر انسانیت کی حریت، سماجی بیداری اور ضمیر کی آواز بنا دیا ہے۔ معاصر غزل اپنی روایتی نغمگی اور جدید انقلابی آہنگ کے ساتھ ہمیشہ اس عظیم فنی سنگم کی احسان مند رہے گی جو اسے زوال سے بچا کر ابدیت کی شاہراہ پر گامزن کر گیا۔

حوالہ جات

۱۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، مباحث، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۹۲

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

۲. جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اردو (جلد دوم)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۰۴
۳. سید احتشام حسین، روایت اور بغاوت، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۴۲
۴. سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۸۸
۵. فیض احمد فیض، نقشِ فریادی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۴۵ء، ص ۴۴
۶. فیض احمد فیض، زنداں نامہ، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۵۶ء، ص ۱۰۴
۷. ممتاز حسین، ناقد اور تنقید، اردو پبلشرز، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۱۲۰
۸. حبیب جالب، گوشے میں قفس کے، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۳۸
۹. حبیب جالب، عہدِ سزا، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۶۲
۱۰. احمد ندیم قاسمی، "حبیب جالب کی غزل گوئی"، مشمولہ: حبیب جالب شخصیت اور شاعری، عالمی اردو ادب، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵
۱۱. کوثر نیازی، زرِ گل، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۶۸
۱۲. کوثر نیازی، لمحے، ماورا بکس، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۳۴
۱۳. سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو ادب، ص ۲۰۵
۱۴. فخر زمان، راستے کی دھول، جامعہ ہمدرد، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۴۲
۱۵. فخر زمان، زہراب، علمی پرنٹنگ پریس، گجرات، ۱۹۶۸ء، ص ۳۳
۱۶. انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۴۱
۱۷. فیض احمد فیض، دستِ صبا، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۳ء، ص ۲۰
۱۸. حبیب جالب، سرِ مقتل، حوری نورانی، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۱
۱۹. گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اسلوبیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۸۸
۲۰. سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو ادب، ص ۲۱۰
۲۱. جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی جائزے، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۷۴

Hawalajaat (Roman)

1. Dr. Syed Abdullah, *Mabahis*, Majlis Taraqqi-e-Adab, Lahore, 1965, p. 92.

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

2. Dr. Jameel Jalibi, *Tarikh-e-Adab-e-Urdu*, vol. 2, Majlis Taraqqi-e-Adab, Lahore, 1973, p. 104.
3. Syed Ehtesham Husain, *Riwayat aur Baghawat*, Maktaba Jamia Limited, New Delhi, 1985, p. 142.
4. Dr. Saleem Akhtar, *Pakistan mein Urdu Adab*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2013, p. 188.
5. Faiz Ahmad Faiz, *Naqsh-e-Faryadi*, Maktaba Jamia Limited, New Delhi, 1945, p. 44.
6. Faiz Ahmad Faiz, *Zindan Nama*, Maktaba Shahrah, Delhi, 1956, p. 104.
7. Mumtaz Husain, *Naqqad aur Tanqeed*, Urdu Publishers, Karachi, 1978, p. 120.
8. Habib Jalib, *Goshay mein Qafas ke*, Maktaba-e-Karwan, Lahore, 1977, p. 38.
9. Habib Jalib, *Ahd-e-Saza*, Maktaba Daniyal, Karachi, 2001, p. 62.
10. Ahmad Nadeem Qasmi, “Habib Jalib ki Ghazal Goi,” in *Habib Jalib: Shakhsiyat aur Shayari*, Aalmi Urdu Adab, Delhi, 1994, p. 15.
11. Kausar Niazi, *Zar-e-Gul*, Sheikh Ghulam Ali and Sons, Lahore, 1973, p. 168.
12. Kausar Niazi, *Lamhe*, Mawara Books, Lahore, 1984, p. 34.
13. Dr. Saleem Akhtar, *Pakistan mein Urdu Adab*, p. 205.
14. Fakhar Zaman, *Raste ki Dhool*, Jamia Hamdard, Delhi, 1995, p. 42.
15. Fakhar Zaman, *Zehrab*, Ilmi Printing Press, Gujrat, 1968, p. 33.
16. Dr. Anwar Sadeed, *Urdu Adab ki Tehreekein*, Anjuman Taraqqi Urdu, Karachi, 1999, p. 241.
17. Faiz Ahmad Faiz, *Dast-e-Saba*, Azad Kitab Ghar, Delhi, 1953, p. 20.

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-18

ماخذ تحقیقی مجلہ

18. Habib Jalib, *Sar-e-Maqtal*, Hoori Noorani, Karachi, 1998, p. 21.
19. Gopi Chand Narang, *Adabi Tanqeed aur Uslobiyat*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 1991, p. 88.
20. Dr. Saleem Akhtar, *Pakistan mein Urdu Adab*, p. 210.
21. Dr. Jameel Jalibi, *Adabi Jaize*, Muqtadara Qaumi Zaban, Islamabad, 1989, p. 74.